مذہب کا انقلابی تصوّر

(از جناب مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے)

بربادی اور کشت و خون کا وہ طوفان اور تخریب و ہلاکت کا وہ شور و شر جس نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے درحقیقت ایک عالمگیر انقلاب کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ انسانیت ایک دور سے گزر کر دوسرے دور میں داخل ہوا چاہتی ہے اور جنگ کی آگ اور دھوئیں کے اندر سے ایک نئی دنیا نمودار ہونے والی ہے۔ اس نئی دنیا کی تعمیر اور اس کے نظام تمدن کی تشکیل کے لیے اس وقت جتنی زندہ اور کارفرما قوتیں باہم کشاکش میں مبتلا ہیں انہیں کی ترکیب سے انسانیت کا نیا ہیولیٰ تیار ہو گا۔ کوئی نئی قوت جو اس تصادم اور کشمکش میں ایک کارفرما عنصر کی حیثیت سے شریک نہیں ہے آنے والی انسانیت اور عالم نو کی تعمیر و تشکیل میں حصہ دار نہ ہو سکے گی۔

یہ وقت ہے کہ ہم مسلمان اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آیا ہمارے موجودہ مذہبی تصورات آنے والے طرز زندگی کو اپنے قالب میں ڈھال سکیں گے۔ اور نئے افکار و نظریات کے مقابلہ میں اپنا موثر وجود باقی رکھ سکیں گے یا زندگی کی تازہ قوتیں ہمارے مذہب اور اخلاقی تصورات کی بنیادوں کو ہلا دیں گی اور ہمیں چار و ناچار اس نظامِ نو میں جذب ہو جانا پڑے گا جس کی تعمیر و تشکیل میں ہمارے اپنے عقائد و نظریات کو کوئی دخل نہ ہو گا۔

مسلمانوں میں مذہب کا جو تصور اس وقت رائج ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دشوار معلوم ہوتا ہے کہ نظام نو کی تشکیل پر یہ تصور ایک زندہ قوت کی حیثیت سے اپنا اثر ڈال سکے گا۔ مذہب کے متعلق ہمارا موجودہ تصور یہ ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ معاملات تمدن سے اس کا تعلق اگر ہے تو بس اتنا کہ انسان اپنی ذات کے لیے کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے

کا احتمال ہو اور جہاں تک ممکن ہو برائی سے بچتا رہے۔ اگر بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ ہمارے علماء و مشائخ اور عوام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے جذبۂ مذہبی میں اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی قوت مفقود ہے۔ مذہب سے جو کچھ محبت مسلمانوں میں باقی رہ گئی ہے وہ صرف حفاظت اور بقاء کی خواہش تک محدود ہے یعنی جو کچھ ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے وہ جانے نہ پائے اور اسلام کے جو کچھ اثرات مسلمانوں کی زندگی پر باقی رہ گئے ہیں وہ زائل نہ ہو جائیں۔ دس کروڑ مسلمانوں میں سے دس ہزار مسلمان بھی نہیں ملیں گے جن کی ہمت پرواز تحفظ اور بقائے وجود سے بلند تر مقام حاصل کرنا چاہتی ہو۔

جس قوم کے افراد میں مذہب کا تصور یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا کہ وہ اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے آنے والے نظام کی تعمیر میں کیا حصہ لے گی۔ جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض، خاندانی مفاد یا زیادہ سے زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر میں منہمک ہوں انھیں اس سے کیا بحث کہ دنیا کس نہج پر چل رہی ہے اور تمدنی نظام کس طرز پر تعمیر ہونے والا ہے۔ جس جماعت کے افراد عبادات (پوجا پاٹ) اور ریاضات سے نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدانِ عمل میں آکر زندگی کی نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں گھر بیٹھے اوراد و وظائف، صوم و صلوٰۃ[ل] اور تلاوتِ قرآن سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں اسلام کی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر دینِ حق کو غالب کرنے کا جذبہ کیونکر پیدا ہو۔

ل روزہ اور نماز کی فرضیت سے انکار قطعاً مقصود نہیں ہے۔ درحقیقت نماز ہی ہمارے جذبۂ دینی کی محافظ ہے۔ لیکن جب کسی عمل کا اصل محرک کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ رسمی طور سے یا محض ضابطہ کی پابندی کے خیال سے کیا جانے لگتا ہے تو اس کے مطلوبہ اثرات مترتب نہیں ہوتے۔ آج ہماری نمازیں کیوں بے اثر ہیں؟ محض اس لیے کہ نماز کو مقصود بالذات خیال کیا جانے لگا ہے۔ مسلمان عام طور سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ محض صوم و صلوٰۃ کی پابندی مذہبیت کی علامت ہے۔ حالانکہ مذہبیت ایک باطنی جذبہ ہے جس کا اظہار زندگی کے جملہ اعمال سے ہوتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

جو لوگ شخصی نجات کے حصول کو مذہبی زندگی کی ابتدا اور انتہا تصور کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ شخصی نجات کو اجتماعی نجات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادی زندگی میں کوئی شخص راست کرداری اور نیک عملی کی راہ میں استوار نہیں رہ سکتا جب تک اس کا اجتماعی ماحول ان صفات کے نشو و نما کے لیے سازگار نہ ہو۔ بڑے بڑے انسانوں اور مستثنٰی شخصیتوں کو چھوڑ کر عام انسانوں کی ذہنیت اور سیرت بالکلیہ ان معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار سے بنتی ہے جو ان کے خاندان اور سوسائیٹی میں رائج اور حکمراں ہوتے ہیں۔ جس معاشرہ میں غلط معیارات، باطل اقدار اور پست اخلاقی تصورات کی فرمانروائی ہو وہاں کوئی انسان محض اپنے شخصی اعمال کی بنا پر مشکل ہی سے نجات کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں فرد کی نجات کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کو بدلنے اور اپنی سوسائیٹی کے اخلاقی تصورات اور معاشرتی معیارات کو درست کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر مذہبیاً یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں برائی دیکھیں، اسے مٹانے کے لیے ممکن جد و جہد کریں۔ من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان (جو شخص تم میں سے کوئی برائی دیکھے اسے چاہیے

(بقیہ سابق) اب یہ جذبۂ باطنی تو باقی نہیں رہا ہے، صرف رسمی مظاہر رہ گئے ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

کہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح۔ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے، اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل میں اسے بُرا سمجھے اور یہ ضعیف ترین ایمان کا درجہ ہے) کیونکہ جو شخص کسی برائی پر صبر کر لیتا ہے اور اسے دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ درحقیقت اپنی شخصی نجات کے امکانات کو کم کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دنیا بھر کی نجات کے لیے فکر کرنی پڑے گی۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اپنے اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر انھیں تمام انسانوں کی برائی اور بھلائی کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (تم دنیا کی بہترین امت ہو۔ نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور لوگوں کو برائی سے روکتے ہو) اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہیگا ورنہ سوسائٹی تو د اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اسے اپنے اعمال درست کر لینے چاہییں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا ضمیر بھی اس سے احتساب کرتا رہے گا۔ لیکن دوسروں کو نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا اس وقت ممکن ہے جب دوسرے لوگ اس کی بتائی ہوئی نیکی کو نیکی خیال کریں اور جس بات کو وہ برا کہے اسے بُرا سمجھیں۔ بالفاظ دیگر اصلاحِ اعمال کی سعی و کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب خیر و شر کا وہ تصور اور حق و باطل کا وہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف ہمیں دنیا کو دعوت دیتی ہے۔ جہاں باطل نظامات نے غلبہ پاکر انسان کے معیارِ ترک و اختیار اور اقدارِ حیات کو اُلٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا اور بُرائی سے روکنا ایک فعل عبث ہے۔ کیونکہ جب تک نیکی اور بدی کا صحیح معیار پھر سے قائم نہ ہو جائے لوگ آپ کی دعوت کو جنون یا دقیانوسیت پر محمول کر کے حق سے اعراض کریں گے۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر چلتے ہیں) ایک تلخ حقیقت ہے جس سے آپ منہ نہیں موڑ سکتے۔ جو نظامِ تمدن دنیا پر غالب ہوگا اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہوگی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ ہوں گے اور اسی کا معیارِ

خیر وشر دنیا میں رائج ہوگا۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر انھیں خیالات و نظریات کا دم بھریں گے جو حکمراں تہذیب اپنے ساتھ لائی ہے۔ پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ دنیا میں حکمراں تہذیب کمزور اقوام کے مقاصد و افکار کو ڈھالا کرتی ہے۔ اس لیے اگر دوسروں کو اور اپنے آپ کو نیک بنانا ہے تو سب سے پہلے باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنا ہوگا اور اسلامی معیارِ خیر وشر کو دوبارہ قائم کرنا ہوگا۔ اسلامی تمدن اور اس کے نصب العین زندگی کے جو اثرات ہماری سوسائٹی میں باقی رہ گئے ہیں ان کی حفاظت کا جذبہ ایک کمزور اور دفاعی جذبہ ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نصب العین کی محبت ہم میں گھٹ کر کس قدر کم رہ گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نصب العین کو لے کر آگے بڑھیں اور اسے عملاً حاصل کرنے کی کوشش کریں ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ بچے کھچے آثارِ قدیمہ رہ گئے ہیں وہ ضائع نہ ہونے پائیں۔ اس قسم کے منفی غایات (Negative Ends) کبھی فلاح و کامرانی کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ جو کچھ ہے اس کے باقی رکھنے کا خیال اصلاً غلط ہے۔ جس جماعت میں صرف بقاء و حفاظت کا جذبہ کام کرتا ہے وہ ہمیشہ شکست و ناکامی کی ذلت سے دوچار ہوتی ہے۔ کچھ حاصل کرنے کی خواہش کیجیے تو جو کچھ ہے نہ صرف وہ باقی رہے گا بلکہ بہت کچھ اور حاصل ہو جائے گا۔ لیکن محض کسی شئے کے باقی رکھنے کی کوشش ایک منفی عمل ہے جس کی ناکامی یقینی ہے۔ حفاظت اور بقاء کا جذبہ حصولِ مقصد کی اقدامی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ایک ایجابی عمل ہے۔ زوال پذیر قومیں چاہتی ہیں کہ ان کی سابقہ جدوجہد اور کوششوں کے نتائج محفوظ رہیں۔ تازہ دم اور زندہ اقوام اپنے ماضی کی عظمت یا گذشتہ جدوجہد کے ثمرات پر کبھی قناعت نہیں کرتیں بلکہ ایک بلندی پر پہنچتے ہی دوسری بلندی کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی ہر کامیابی ایک نئی جدوجہد کا پیام لاتی ہے۔ ان کی ہر فتحمندی سعی و طلب کے لیے تازیانہ بن جاتی ہے۔

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کی یہ کوشش کہ جو کچھ اسلامیت ان میں رہ گئی ہے وہ کم نہ ہونے پائے اور اسلاف جو کچھ سرمایۂ علم چھوڑ گئے ہیں وہ ضائع نہ ہو، ایک منفی مقصد ہے جس کی سرحدیں بے مقصدی سے جا ملتی ہیں۔

(۲)

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد، مقاصد کی کشش اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ بے مقصدی موت ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کامیابی اور عزت انھیں افراد کے حصہ میں آتی ہے جو ابتدا سے کسی مقصد کا شعور رکھتے ہیں اور اس کے حصول میں زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ شخص جو کوئی متعین مقصد نہیں رکھتا ہے یا جسے اپنے مقصد کا پورا پورا شعور نہیں ہوتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ناکام رہتے ہیں جو مقصد تو رکھتے ہیں مگر اس سے اتنی وابستگی نہیں پیدا کر سکتے کہ ضرورت پڑنے پر دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ لیں۔ مقصد اور نصب العین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ جنگ سے پہلے جن لوگوں نے انگلستان، جرمنی اور روس کا سفر کیا تھا ان کا بیان ہے کہ انگلستان میں انھوں نے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی ربط و نظم نہیں پایا۔ ہر فرد اور گروہ اپنے اپنے جداگانہ مقاصد کی تکمیل میں مصروف تھا اور مختلف طبقوں اور جماعتوں کی مساعی میں کوئی مشترک جذبہ کارفرما نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے برعکس روس اور جرمنی میں اجتماعی جدوجہد کا ایک مرکز تھا۔ سب کے سب ایک مشترک مقصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہر شعبۂ زندگی کا دوسرے شعبہ سے گہرا ربط تھا۔ لیکن اگر اس وقت کوئی سیاح انگلستان جا کر وہاں کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرے تو نقشہ بدلا ہوا نظر آئے گا۔

اب نہ انگلستان کی اجتماعی سرگرمیوں میں وہ آہستہ روی ہے، نہ افراد کے اغراض و مفاد کا کوئی سوال ہے، نہ مختلف جماعتوں میں باہم نزاع و اختلاف ہے۔ ہر کام سے تنظیم اور مقصدیت نمایاں ہے۔ اس انقلاب اور تبدیلی کا بجز اس کے اور کیا سبب ہو سکتا ہے کہ جنگ سے پہلے انگریز قوم کے سامنے کوئی معین نصب العین نہ تھا اور اب ایک واضح مقصد پیشِ نظر ہے جس کے حصول میں افرادِ قوم اپنے ذاتی خاندانی اور طبقاتی مفادات کو بھولے ہوئے ہیں۔ ایک اور مثال لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ تاریخ کا مطالعہ محض اس غرض سے کر رہے ہوں کہ اپنی حاصل کردہ معلومات کی وجہ سے آپ اپنے حلقۂ احباب میں عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور تاریخی مباحث پر گفتگو کرتے وقت معلومات کی کمی کے باعث دوسرے لوگ آپ کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھیں۔ چونکہ آپ کا یہ مقصد ایک منفی مقصد ہے اس لیے آپ کی معلومات اپنی وسعت کے باوجود بے ربط رہیں گی۔ آپ کو تاریخی واقعات تو یاد ہو جائیں گے لیکن ان واقعات کی توجیہ کے لیے آپ کے سامنے کوئی معیار نہ ہوگا۔ بس آپ کے ذہن میں معلومات کا ایک منتشر اور بے جان ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔ اب فرض کیجیے کہ آپ چند دنوں کے بعد اشتراکیت کے حامی ہو جائیں۔ معاً آپ کو تاریخی واقعات کی توجیہ کے لیے ایک کنجی ہاتھ آجائے گی۔ آپ کی معلومات میں داخلی ربط اور تسلسل پیدا ہو جائے گا۔ مختلف واقعات کی اضافی اہمیت کا ایک پیمانہ آپ کے پاس ہوگا اور آپ تاریخی واقعات کی قدر و قیمت ان کے معاشی نتائج کے اعتبار سے متعین کرنے لگیں گے۔ یا آپ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے تاریخ پڑھنا شروع کریں جس کی نظر میں تاریخی واقعات اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے اہم ہوتے ہیں۔ آپ فوراً محسوس کریں گے کہ ایک معیارِ نقد و نظر آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آپ کی معلومات اپنی وسعت و کثرت کے باوجود ایک مرکز کے گرد مخصوص ترتیب کے ساتھ جمع ہو جائیں گی۔ یہ تبدیلی محض مقصد اور نصب العین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آپ تاریخ محض معلومات کی نمائش کے لیے پڑھتے ہیں تو آپ کا مقصد بے جان ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کی معلومات میں بھی جان نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مسلمان یا اشتراکی کی

حیثیت سے جب آپ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کے پیش نظر ایک حقیقی اور ایجابی مقصد ہوتا ہے، اور یہی مقصد آپ کی معلومات میں روح پیدا کر دیتا ہے۔

غرض جہاں دیکھئے مقصد اور نصب العین ہی حیات بن کر افراد و اقوام کو سرگرم عمل کرتا ہے، ان میں زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اور مقصد ہی ان کے تمام اقدار و معیارات کا سرچشمہ اور ماخذ ہوتا ہے۔ تمدنی اور معاشرتی نظامات درحقیقت مقاصد و غایات کے ایک نظام پر قائم ہوتے ہیں۔ جس میں کوئی مقصد بجائے خود منتہائے نظر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے سے برتر مقصد کا تابع اور اس سے ماخوذ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پورا سلسلہ مقاصد ایک آخری غایت الغایات پر ختم ہوتا ہے۔ جو تمدنی زندگی کا منتہائے حقیقی اور مقصود اصلی ہوتا ہے۔ دوسرے تمام مقاصد غایت الغایات سے اپنی زندگی پاتے ہیں اور اگر کسی وقت اس نظام کے دوسرے مقاصد کا رشتہ آخری مقصد یا غایت الغایات سے ٹوٹ جاتا ہے تو سارے مقاصد بے جان ہو جاتے ہیں۔ اور تمدنی زندگی میں ضعف اور انتشار کی علامات ظہور کرنے لگتی ہیں۔

مثال کے طور پر کسی قوم کی عسکریت اور فوجی طاقت کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت اور کوئی نظام فوجی طاقت کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن عسکریت فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہوا کرتی ہے۔ فوجی طاقت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب پوری قوم کسی برتر مقصد کیلئے کام کر رہی ہو اور عسکریت اس کیلئے بطور وسیلہ ضروری ہو۔ جب فوجی طاقت کے حصول پر توجہ کی جاتی ہے تو لازماً افراد قوم کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ اگر جسمانی صحت کی ترقی ایک تبعی مقصد قرار پاتی ہے صحت عامہ کی اصلاح و ترقی کیلئے فن طب اور علم حفظانِ صحت پر توجہ مبذول کی جاتی ہے اور نتیجۃً علوم طب کی ترقی اور اشاعت بھی ایک ذیلی مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح مقاصد کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ جو کسی آخری مقصد کے تابع ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ان تبعی مقاصد کو حقیقی مقصد قرار

دے دیا جائے اور افراد قوم اُس غایت الغایات کو بھول جائیں۔ جس کیلئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ کیا ان مقاصد سے کوئی مقصد بھی زندہ رہ سکے گا؟ جہاں فوجی قوت یا صحت جسمانی فی نفسہ مقصود ہو وہاں تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مقصد بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ حرکت و عمل کا جذبہ تو اس آخری مقصد کا آفریدہ تھا جس سے تبعی مقاصد برگ و بار کی طرح پیدا ہوتے تھے۔ جب مقصود اعلیٰ باقی نہ رہا جو اس پورے نظام مقاصد کا ماخذِ حیات تھا تو اس کی دوسری شاخیں کیوں نہ مرجھا جائیں۔

یہی حال اسلام کے مذہبی نظام کا ہے۔ یہ پورا نظام اعلاء کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی وطلب پر استوار ہے۔ روزہ اور نماز، حج اور زکوٰۃ، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر بس اُسی کی بندگی کی جائے اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی شکل اختیار کریں یا دیوتاؤں اور بتوں کی، طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں یا آمروں اور لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں۔ جبکہ مسلمانوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیکر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو تھی، جب تک ان میں اسلام کے اخلاقی (اقدار) اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بنا کر اپنے خدا کو راضی کرنے کی خواہش تھی۔ اس وقت تک اِن کی نمازوں میں روح تھی، عبادات میں جان تھی اور مذہبی نظام کے تمام اجزاء اس غایت اُخریٰ سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔ جب سے یہ غایت نظروں سے اوجھل ہوئی اسلامی زندگی کی ساری شاخیں مرجھا گئیں، نماز و روزہ اور شعائر مذہبی کو مقصود بالذات خیال کیا جانے لگا، قرآن کی تعلیم و تدریس اور علوم مذہبی کی تحصیل و اشاعت ایک خود مکتفی غایت بن گئی، اور اس طرح مذہبی نظام کے مختلف اجزاء کا باہمی ربط و اتصال عملاً ختم ہو گیا۔ کیونکہ جب کوئی عمل اپنا آپ مقصد بن جاتا ہے، تو پھر اس میں سے زندگی کی روح بھی سلب ہو جاتی ہے، ہر عمل کی زندگی اس کے مقصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جہاں یہ وابستگی کم ہوئی عمل کی گرمجوشی اور رُوح بھی پژمردہ ہو جاتی ہے

آج مسلمانوں کی دینی اور دنیوی اصلاح کیلئے مختلف پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں۔ کہیں تنظیم کی پکار ہے، کہیں عسکریت اور فوجی طاقت کو قومی خرابیوں کا واحد علاج قرار دیا جا رہا ہے، کہیں ماہرین تعلیم مسلمانوں کے جہل کو دور کرنے کیلئے مدارس کے قیام اور جامعاتی تعلیم پر زور دے رہے ہیں، کہیں مذہبی تعلیم کا چرچا ہے اور درسِ قرآن کے ذریعہ مسلمانوں کو مذہب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ساری کوششیں تقریباً پچاس سال سے جاری ہیں، جب سے سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور انگریزی تعلیم کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن اس اصلاحی جدوجہد کو جیسی کامیابی چاہئے تھی نہیں ہوئی اس ناکامی کا واحد سبب یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ابھی تک کسی حقیقی مقصد سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ جب تک ان میں کسی اجتماعی تخیل سے محبت نہ پیدا ہو اور حصول مقصد کی طلب اُن کے جذبہ عمل کو بیدار نہ کر دے، یہ کوششیں اسی طرح ناکام رہیں گی۔ علم کی تحصیل ہو، عسکریت کا شوق ہو یا مذہب کا شغف، یہ سب بہر حال وسائل ہیں، مقاصد نہیں ہیں۔ اور مقصد کی غیر موجودگی میں وسائل کیا معنی رکھتے ہیں؟ وسائل تو حصولِ مقصد کی سعی و کوشش سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ جو شخص کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال اس کے حصول کیلئے ضروری وسائل اختیار کرے گا۔ یہاں سارا زور وسائل پر دیا جا رہا ہے، اور مقصد سرے سے غائب ہے۔ یہ طریقۂ کار اصولاً غلط ہے۔ قوموں میں پہلے مقصد کا شعور اور اس سے عشق پیدا ہوتا ہے، پھر اس کی طلب اور اس کے حصول کی کوشش میں ضروری وسائل اور تدابیر خود بخود اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ عقلی ترقی بھی مقصد اور نصب العین کی محبت ہی سے ظہور میں آتی ہے، کیونکہ انسان اپنی عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے پورے جوش و خروش کے ساتھ اسی وقت کام لیتا ہے۔ جب اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہوں۔ محبت کا جنون اور عقل کی ترقی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنون سے ہی عقل صحیح پیدا ہوتی ہے۔

"زمانہ ہیچ نداند حقیقت اور ا! جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است"

انسان کی عقلی قوتیں اس کی خدمت گار ہیں، آقا نہیں ہیں۔ عقل کی حیثیت بالکل ایک آلہ کی سی ہے جس سے ہم اپنی خواہش کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ مقاصد و غایات عقل سے نہیں پیدا ہوتے۔ اس لئے یہ کوشش بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کو علوم عقلیہ کی طرف متوجہ کرا کے اُن کی ترقی کا سامان پیدا کیا جائے ترقی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے اور جدوجہد کیلئے نصب العین کا ہونا ضروری ہے۔ آج اگر مسلمان کسی اجتماعی تخیل یا نصب العین سے محبت کرنے لگیں، پھر دیکھئے کہ اس کے حصول کی جدوجہد اور کوشش میں کس طرح اُن کی عقلی قوتیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، عسکریت کی تبلیغ اور علوم دینی اور دنیوی کی تحصیل، یہ سب کام نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ خود بخود حصولِ مقصد کی کوشش میں حسن وخوبی سے انجام پذیر ہو جائیں گے۔

عہدِ رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق تھا۔ وہ ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لئے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے سہی نہ ہو۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے علم کی روشنی حاصل کی، جاہلیت کے رسوم و عادات کو یکلخت ترک کر دیا اور چند سال کے عرصہ میں وہ ساری صفات حاصل کر لیں۔ جو دنیا کی ترقی پذیر اور بڑھنے والی قوموں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جہالت کو دور کرنے کی کوشش میں اشاعت تعلیم کی غرض سے مکتب اور مدرسے نہیں کھولے، عربوں کی سماجی اور معاشی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ سب سے پہلے اُنہیں ایک تخیل عطا کیا، ایک نصب العین اور مقصد سے آشنا کیا، اور جب اس تخیل کا عشق اور اس مقصد کی محبت اُن کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو پھر اُن کے لئے شریعت کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا اور فرائض کو بجالانا کوئی دشوار کام نہیں رہا۔ عشق کا جنون وہ ہے کہ جب سر پر سوار ہوتا ہے تو محبوب کی طلب میں کوئی مزاحمت نہیں معلوم ہوتی، کوئی مصیبت

مصیبت نہیں رہتی، اور شوقِ منزل انسان کو راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

"وہ پائے شوق دے جو جہت آشنا نہ ہو — پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں"

عشق کی آگ ساری مصیبتوں، کلفتوں اور تمام آلامِ حیات کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

"آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا"

ہمارا مذہب اس لئے بے جان ہے کہ تخیل کی عظمت اور مقصد کے عشق سے اس کا تعلق ٹوٹ چکا ہے اس لئے نماز و روزہ اور فرائض دین کی پابندی ہمارے لئے لذت و حلاوت سے خالی ہے۔

(۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اسلام اور ہمارے اسلام میں بنیادی فرق و اختلاف ہے۔ ہمارا مذہب وہ مذہب نہیں ہے، جسے عہدِ رسالت کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا، اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار، انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا، جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد تھی، اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں۔ بلکہ عالم انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا صحابہ کرام ایک نظامِ تمدن اور طرزِ زندگی کے داعی تھے، ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے۔ اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار تھے، چنانچہ اُن کے اعمال و عبادات کی قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین اور غایتِ اولیٰ کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ اُن کے اخلاص و اعتقاد کا پیمانہ تھا، اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ وفضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجۃ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ (اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو گھر بیٹھنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے اگرچہ ہر ایک سے اچھائی کا وعدہ کیا ہے)۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظامِ تمدن اور طرز تفکر کی تبلیغ اُن کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ تھا

کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ریاضتیں ان کی نگاہ میں اکارت ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ جہاد ہی کے سلسلہ میں کلام مجید ارشاد فرماتا ہے۔ " قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال ن اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصو حتی یاتی اللہ بامرہ۔" (اے رسول، کہدو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے اہل خاندان اور وہ مال جنہیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو، اور وہ قیام گاہیں جو تمہیں پسند ہیں، اگر یہ سب چیزیں اللہ اور رسول سے اور اللہ کی راہ میں جدو جہد کرنے سے تم کو عزیز تر ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم تمہارے سامنے لے آئے''

غور کیجئے یہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جا رہی ہے؟ اُن سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص وللّٰہیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوئے مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے۔ اس کے باوجود انہیں چیلنج دیا جا رہا ہے۔ کہ اگر زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے دین حق کی اقامت اور اعلا کلمتہ اللہ کی راہ میں ادنٰی سی رکاوٹ بھی پیدا کی تو پھر خدا کے حکم کے منتظر رہو۔

[آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے اوراد و وظائف، اور ہماری پرستشیں اور ریاضتیں، آخروی نجات و فلاح کیلئے کافی ہیں انہیں غور کرنا چاہئے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں اور عبادتوں اور اعمال صالحہ کے باوجود انجام سے اس لئے ڈرایا جا رہا ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سست پڑ جائیں، تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہیں جبکہ ہم خدا کے دین کو سربلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کیلئے ادنٰی ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں، یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اب اس آرزو اور تمنا سے خالی ہو

چکے ہیں کہ خدائی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کئے ہوئے قانونِ سعادت، اور ضابطۂ حیات کا بول بالا ہو۔ کیا آج اسلامی نظام عملاً اسی طرح کفر کے غلبہ سے گھرا ہوا نہیں ہے جس طرح وہ مدنی زندگی میں کفر کی طاقتوں سے محصور تھا؟ اور کیا آج دینِ حق کے قیام اور اسلامی طرزِ زندگی کو ایک عملی حقیقت بنانے میں جانفروشی اور ایثار و قربانی کی کچھ کم ضرورت ہے؟ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم اپنی عبادات اور اعمال صالحہ کے باوجود خدا اور رسولؐ کی بارگاہ میں کیوں معتوب ہوئے تھے؟ محض اس لئے کہ وہ اسلام و کفر کی کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے باز رہے تھے۔ اس غفلت پر انہیں ایسی سخت سزا دی گئی کہ دورانِ سزا میں زندگی اُن کیلئے وبال ہوگئی۔ اور خدا کی زمین انہیں تنگ نظر آنے لگی۔ یہ واقعہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ دینِ حق کے قیام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے مقابلہ میں انسان کے کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور اگر اس فرض میں انسان سے کوتاہی ہو جائے تو پھر نہ نمازیں اس کے کام آسکتی ہیں اور نہ عبادات سے نجات مل سکتی ہے اس کا سبب بھی ظاہر ہے۔ نماز روزہ اور عبادات اور اعمال صالحہ سب درحقیقت اس لئے ہیں کہ کائناتِ عالم میں صرف خدائے واحد کی بندگی ہو، اسی کا قانون چلتا ہو اور اسی کی مرضی حکمران ہو۔ اگر دنیا معبودانِ باطل کی بندگی میں لگی ہو۔ غیر الٰہی نظامات غالب ہوں اور اسلامی اقدار آپ کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی ہوں، لیکن آپ مسجدوں میں نمازیں پڑھتے رہیں یا لمبی لمبی تسبیحیں لیکر شب بیداری اور تہجد گذاری کرتے رہیں تو حقیقتاً آپ کو نہ اسلام سے محبت ہے اور نہ کفر سے نفرت اس لئے کلام مجید نے صاف کہہ دیا ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔ "اجعلتم سقایۃ الحاج و عمارۃ المسجد الحرام کمن امن باللہ و الیوم الاخر و جاھد فی سبیلہ (کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر سمجھ رکھا ہے؟) اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف

گیا ہے کہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار یہی ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلہ میں خدا کا بول بالا کرنے کیلئے بیتاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشات نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے، لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبرگیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے، غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے، لیکن خدا کے دین کیلئے سر دیدینا صرف رضائے الٰہی کی طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہئے ہو تو دیکھو کہ خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من مات ولم یغزُ ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃٍ من النفاق" (جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا)۔ غور کیجئے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں؟ جو لوگ ہم میں سے دیندار ہیں انہیں کے دلوں کا جائزہ لیجئے۔ کیا ان میں سرفروشی اور جان نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے؟ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ہم موجودہ غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظام تمدن سے غیر مطمئن ہوں اور اُسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کرنے لگے جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور غیر اسلامی نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں۔ اور نہ تو اس استفادہ

کو بُرا سمجھتے ہوں۔ اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار واقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز اور تسبیح وتہلیل کی بنا پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں انہیں کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان ومال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ واشاعت کیلئے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کیلئے ایثار و جانفروشی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہوسکتا ہے۔ جو کافرانہ تہذیب سے بیزار اور اُس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزومند ہو۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی نظامات سے ہماری وابستگی اس قدر پختہ ہوگئی ہے کہ نہ صرف ہم میں ان نظامات سے باہر نکلنے کی خواہش باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، ہماری تمام کوششیں اِن نظامات کی حفاظت وبقا میں مصروف ہوجاتی ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ فی الجملہ مذہب کے پابند ہیں انہوں نے بھی عبادات و ریاضات اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی کو پورا مذہب سمجھ رکھا ہے۔ غیر اسلامی تہذیب وتمدن کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی نہ ان میں آرزو باقی رہ گئی ہے اور نہ اس کے لئے وہ کسی قسم کی جد وجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اگر مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں ہم اپنے قلوب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے ننانوے فیصد بلکہ اس سے زیادہ اشخاص نفاق کے زنگ سے آلودہ ہیں۔ کیونکہ ہم میں غیر اسلامی تہذیب و نظامات سے نکلنے کی خواہش عملاً مفقود ہے۔ اور در حقیقت یہی ہماری بے بسی، ذلت اور تمام قومی اور دینوی مصائب کی اصلی علت ہے کہ اسلامی اقدار وغایات کی طلب اور اسلامی نظام کے قیام کی جد وجہد سے ہم بالکل غافل ہیں جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ نہ پیدا ہوگا اور جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو اور خواہش اُن کے دلوں کو بیتاب نہ کردے گی۔ یہ ساری سیاست بازی اور نمائشی تنظیم کچھ کام نہ آسکے گی اور ذلت ورسوائی کا داغ ہماری قومی پیشانی پر اسی طرح لگا رہے گا خواہ ہم میں سے ہر شخص پانچ وقت کی بجائے سو وقت کی نمازیں پڑھنے لگے اور ہمارا ہر نوجوان علوم دینی میں کامل و ماہر بن کر آسمان شہرت پر چمکنے لگے۔

حضور رسالتماب کا ارشاد اس بارے میں بالکل صاف اور غیر مبہم ہے۔ آپ نے فرمایا: "مَا تَرَكَ قَوْمٌ الْجِهَادَ إِلَّا عَمَّهُمُ اللهُ تَعَالَىٰ بِالْعَذَابِ" (جو قوم جہاد ترک کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر اپنا عذاب عام کر دیتا ہے)۔ جب سے مسلمانوں نے مجاہدانہ زندگی ترک کی ان پر غلامی اور کفار کے تسلط کا عذاب نازل ہوا۔ مجاہدانہ زندگی مسلمان کی سب سے بڑی عزت اور فضیلت ہے۔ چونکہ ہم مذہب کے معمولی فرائض و واجبات پر قانع ہو گئے ہیں اور فضیلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی آرزو سے ہمارے قلوب خالی ہو چکے ہیں۔ اسی لئے ہم پر پستی اور دون ہمتی طاری ہے۔ نیکی یہ بھی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں صعوبتیں برداشت کرے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کیلئے ایثار و جانفروشی کرے۔ لیکن ان دونوں نیکیوں میں ایک عظیم الشان فرق ہے۔ جو لوگ صرف ادنیٰ نیکیوں پر قناعت کر لیتے ہیں انہیں دنیا میں ترقی اور سربلندی کی خواہش سے بھی دست بردار ہو جانا پڑتا ہے۔ رفعت و سربلندی صرف ان قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے جو اعلیٰ ترین نیکیوں اور بلند ترین درجات کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔ انسان کی کامیابیاں اور مسرتیں اس کے تخیل کی رفعت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر تخیل بلند ہے تو کامیابیاں اور مسرتیں بھی بلند ہوں گی۔ ہم نے مذہب کا پست تصور اختیار کیا ہے اس لئے ہماری کامیابیوں کا دائرہ محدود اور مسرتوں کی سطح بھی پست ہے۔

(۴)

اسلامی نظام تمدن کے قیام اور دین حق کے غلبہ کا نام سن کر مسلمانوں کا ایک گروہ اولیا اور صوفیائے کرام کی زندگیوں کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس گروہ کا استدلال یہ ہے کہ حضرات صوفیا نے جو اعمال صالحہ اور تزکیہ نفس کے اعتبار سے ہم سے بدرجہا بلند تھے اسلام کو ایک نظام تمدن کی حیثیت سے نہیں پیش کیا اور نہ اپنے زمانہ کے سیاسی اور معاشی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اعمال صالحہ کی تلقین اور تزکیہ نفوس کے کام کو اپنے لئے کافی خیال کیا۔ جب اس بلند پایہ جماعت نے جو شریعت کے اسرار و رموز کی حامل تھی اپنے وقت کے تمدنی نظام کو ہاتھ نہیں لگایا تو ہم لوگ کیسے جسارت کر سکتے ہیں کہ اپنے تمام عیوب و نقائص

کے ساتھ اسلامی نظام کو بلند و برتر کرنے کا عزم لیکر اٹھیں - یہ کام صرف اسی جماعت سے ہو سکتا ہے جو اعمال و اخلاق کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہو۔

اس طرز استدلال میں کئی ایک خامیاں ہیں جن پر اکثر لوگ غور نہیں کرتے۔

اولاً حضرات صوفیاء اور اولیاء کرام نے اصلاح اعمال اور تزکیہ نفوس کا جو گرانقدر کام انجام دیا وہ ہم سب لوگوں کیلئے نمونہ ہے لیکن جو کچھ انہوں نے نہیں کیا اُسے ہم اپنے لئے سند نہیں بنا سکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو مستثنےٰ کر کے کسی فرد یا افراد کی غیر مشروط پیروی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے۔ خواہ ان کا رتبہ خدا کے ہاں کیسا ہی بلند ہو۔ اطاعت مطلق اور اتباع کامل صرف حضور رسالتمآب کی ذات پاک کیلئے مخصوص ہے۔ اس لئے کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کو اس طرح نمونہ بنا کر پیش کرنا کہ گویا جو کچھ اُس نے کیا اور جو کچھ نہیں کیا سب ہمارے لئے سند ہے یا اس کا ہر فعل ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ہر قول ہمارے لئے واجب التعمیل ہے، یہ اتنی بڑی گمراہی اور ضلالت ہے کہ اس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہیئے۔ صوفیاء کرام کی تقلید و اتباع ایمان و اسلام کے شرائط میں سے نہیں ہے۔ جو لوگ بزرگوں کا احترام اور اولیاء و صوفیاء کی محبت میں یہاں تک متجاوز ہو چکے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی بحث یا استدلال بیکار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں اشخاص کی محبت اسلام کی محبت پر اس طرح غالب آگئی ہے کہ اگر اسلام کو اُن کی اس محبت سے نقصان پہنچ رہا ہو تو بھی وہ اس سے دست کشی پر آمادہ نہ ہونگے۔ ایسے لوگوں سے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اولیائے کرام اور حضرات صوفیاء کی بلندی مرتبت اور ان کے درجات عالیہ کو پوری طرح نظر میں رکھتے ہوئے اور ان کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے بھی ایک مسلمان صرف حضور رسالت مآب کی زندگی اور حضور کی حیات طیبہ کو اپنے لئے مشعل ہدایت بنا سکتا ہے۔ اور اسی میں اپنے لئے راہ سعادت تلاش کر سکتا ہے۔ اور حضور کے بعد اگر کوئی جماعت ہمارے لئے سب سے زیادہ عزت و توقیر کی مستحق اور اتباع و تقلید کی لائق ہے تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے

جنہوں نے جہاد فی سبیل اللہ بھی کیا، غیر اسلامی نظامات کو دُنیا سے مٹانے کیلئے اپنی جانیں بھی قربان کیں تدبیر مملکت اور انتظام حکومت کا بار بھی اُٹھایا اور ان "دنیوی" کاموں کو کبھی "دینداری" سے الگ خیال نہیں کیا۔ حضرات صوفیا اور اولیائے کرام نے تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ اعمال کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی تنقیص کرنا یا اُن کے اثرات و نتائج سے انکار کرنا کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن اس ضمن میں بحث کا جو پہلو نظروں سے اوجھل رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ اصلاحِ اعمال اور تزکیۂ نفوس کا کام اسی سوسائٹی میں بارآور ہو سکتا ہے جس کے افراد اسلامی نصب العین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اور فی الجملہ اسلامی نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کے حامل ہوں۔ لیکن جس نظامِ تمدن میں انسان اخلاقی اقدار و غایات کا منکر ہو گیا ہو، جہاں مادی نقطۂ نظر انسان پر اس طرح چھا گیا ہو کہ وہ روحانی مقاصد۔ اور باطنی اصلاح کو لایعنی قرار دینے لگے، جس ماحول میں اسلامی فکر و نظر اور اسلامی نصب العین زندگی عملاً معدوم ہو۔ وہاں اصلاحِ اعمال اور تزکیۂ نفوس کا کام کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔ آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بالخصوص مغرب زدہ جماعت نیکی اور بدی کے اسلامی تصورات سے برگشتہ اور سراسر کافرانہ تصورات میں غرق ہے۔ مذہب و اخلاق کے متعلق بھی اُن کا تصور اور انداز فکر وہی ہے جسے انہوں نے مغرب سے ورثہ میں پایا ہے۔ جب ہماری سوسائٹی میں اسلامی افکار اور تصورات کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی ہے اور باطل تخیلات کا غلبہ اس قدر سخت ہوتا جا رہا ہے تو اصلاح اعمال کی کوشش کیسے کارگر ہو سکتی ہے جہاں سرے سے ایمان ہی غائب ہو۔ وہاں عمل صالح کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اہل تصوف کی خانقاہیں سرد ہیں اور ان نفوسِ قدسیہ کے وجود سے دنیا خالی نظر آتی ہے۔ جن کی ایک نگاہ انسانوں کو قلب ماہیت کر دیتی تھیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ تمدنی اور معاشرتی ماحول میں اس قسم کے افراد نشوونما

یہ سوال کہ اصحابِ تصوف اور اولیائے اکرام نے اپنے زمانہ کے سیاسی اور تمدنی نظام کو کیوں ہاتھ میں نہیں لیا، بالکل بے معنی ہے۔ وہ تمدنی نظام جس میں اُن کی نشوونما ہوئی تھی اصلاً اسلامی

نظام تمدن تھا۔ حکومت کا طرز اور سیاست کا نظام ضرور بدل گیا تھا لیکن معاشرت و تمدن کا پورا ڈھانچہ اسلامی طرز پر بدستور قائم تھا۔ غیر اسلامی اثرات کی آمیزش سے وہ دَور بھی پاک نہ تھا لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمدنی اور معاشرتی نظام میں اسلامی عنصر غیر اسلامی عناصر پر غالب تھا۔ اخلاقی تصورات، روحانی اقدار اور معاشرتی معیارات میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا مگر اس طرح نہیں کہ اُن کا اسلامی رنگ بالکل اڑ گیا ہو اسلام کی حقیقی رُوح اپنی پوری تازگی اور قوت کے ساتھ نہیں تو کم از کم ایک کمزور اور معمولی شکل میں اس دَور کے افکار و اعمال میں جاری و ساری تھی۔ سلاطین اور امرا اسلام سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن عام مسلمان اُن کی بُرائیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے۔ ایسے دَور میں اگر ارباب تصوف اور اہل باطن نے تزکیہ نفوس اور اصلاح اعمال کی کوشش پر اکتفا کیا تو ایسا کرنے میں وہ کسی حد تک حق بجانب تھے انہوں نے نظامِ سیاست اور طرزِ حکومت و تمدن کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ حکومت کا مذہب اسلام تھا، ملکی قوانین قانونِ شریعت کے تابع تھے اور امراء و سلاطین اپنی ساری بدعنوانیوں اور فسق و فجور کے باوجود اسلام سے اتنی محبت ضرور رکھتے تھے کہ غیر اسلامی تصورات و افکار کی دانستہ اشاعت انہیں گوارا نہ تھی۔ اور نہ وہ باطل خیالات و افکار کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ تھے۔ بلکہ بہت سے سلاطین و امراء شخصی حیثیت سے بھی دیندار اور متقی تھے۔ خود ہندوستان میں سلطان شمس الدین التمش، بلبن، محمد تغلق، عالمگیر اور بعض دیگر امراء و سلاطین اپنے اتقاء اور شغفِ مذہبی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ مسلمان تھے۔ لیکن آج حالات کیا وہی ہیں؟ کیا وہ نظام حکومت اور وہ ملکی قانون، جس کے تحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، شریعت سے کوئی دُور کی نسبت بھی رکھتا ہے؟ موجودہ زمانہ کے امراء اور اصحابِ اثر کو چھوڑیے، کیا آج عام مسلمانوں پر بھی اسلامی عقائد و افکار کی گرفت ویسی ہی ہے، جیسی کہ بارہویں اور تیرہویں صدی میں ہندوستان کے امراء اور سلاطین پر تھی؟ جب عوام کی یہ حالت ہو تو امراء اور اصحابِ دولت کی کیفیت معلوم۔ کیا ہمارے آج کے معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار میں اسلامی رُوح کا

ہلکا سا عکس بھی باقی رہ گیا ہے؟ کیا اسلامی تمدن کی ادنیٰ سی جھلک بھی موجودہ سوسائٹی میں نظر آتی ہے؟ اسلامی نظام کے قالب میں صرف رُوح کی تازگی اور زندگی کی رونق ہی کم نہیں ہو گئی ہے بلکہ خود یہ قالب بھی مسخ ہو گیا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان تمام امور کو سامنے رکھ کر حضرات صوفیا اور اولیائے کرام کے عمل کو بطور سند پیش کرنا موجودہ زندگی اور حالات سے کامل بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہمیں ایک اور بڑی تبدیلی کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں مملکت اور حکومت کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر اس کے اثرات اتنے گہرے اور دور رس ہو گئے ہیں کہ مملکت خود ایک مستقل دین بن گئی ہے۔ جو اپنے دائرۂ اثر میں کسی اور طاقت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور چونکہ اس کا دائرۂ اثر زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے اس لئے وہ حقیقتاً مذہب کو کسی گوشہ میں مطلق العنان اور خود مختار نہیں چھوڑ سکتی ہے۔ انیسویں صدی کے ایک انگریزی مدبر لارڈ ملبورن (Lord Melbourne) نے اسٹیٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے وظائف کے متعلق یہ رائے زنی کی تھی کہ اس کا کام صرف امن عامہ کو برقرار رکھنے اور معاہدات و مواثیق کی تعمیل کرانے تک محدود ہونا چاہئے۔ اور واقعۃً آج سے دو سو برس قبل اسٹیٹ کی غایت وجود اس سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ ایسے اسٹیٹ میں دین و مذہب کسی نہ کسی درجہ میں ایک بااختیار اور قائم بالذات طاقت کی حیثیت سے اپنا کام انجام دے سکتا تھا۔ اس لئے خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی ایک ہزار سال تک سیاسی نظام کے بگاڑ نے اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کو وہ نقصان نہیں پہنچایا۔ جتنا گذشتہ سو دو سو سال کے غیر اسلامی تسلط نے اس قلیل عرصہ میں پہنچایا ہے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں سیاسی نظام ہمہ گیر نہ تھا اور تمدن و معاشرت کے دائرہ تک سیاسی تبدیلیوں اور سلاطین و امراء کی غیر اسلامی روش کے اثرات پہنچتے پہنچتے اس قدر ضعیف ہو جاتے تھے کہ ان کی وجہ سے اسلامی اقدار اور طرز زندگی کو کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہو سکا۔ تعلیم و تربیت کے سارے وسائل اور ادارے حکومت و سیاست کی زد

سے محفوظ تھے ۔ اور ان وسائل پر قبضہ انہیں لوگوں کا تھا ۔ جو اعتقاداً اور عملاً سچے مسلمان تھے ۔ لیکن آج معاملات اس کے بالکل برعکس ہیں ۔ مملکت افراد کی زندگی کے ہر گوشہ پر مسلّط ہے ۔ معاشرت و معیشت سے لیکر تعلیم و تربیت اور خاندانی زندگی کی تشکیل تک اسٹیٹ کے قبضہ اقتدار میں ہے ۔ ریڈیو، سینما، صحافت، مدارس، یونیورسٹیاں، ان میں سے کوئی بھی آزادانہ اور خود مختارانہ طور پر اپنا کام انجام نہیں دے سکتا ۔ مختصر یہ کہ انسانی افکار و نظریات اور تمدنی اقدار و غایات کی تشکیل پر مملکتی اقتدار کا اثر اس قدر مضبوطی سے جما ہوا ہے ۔ کہ کوئی فرد آزادی کی فضا میں سانس نہیں لے سکتا ۔ اسٹیٹ جو عقائد و تخیلات افراد پر عائد کرنا چاہتا ہے بغیر کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی تشدد کے اپنے وسائل نشر و تبلیغ اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ عائد کر دیتا ہے ۔ نظری حیثیت سے افراد آزاد ہیں کہ جو عقائد چاہیں اختیار کریں، جو دین چاہیں قبول کریں اور جو طریق زندگی انہیں پسند ہو اس پر عمل پیرا ہوں، لیکن عملی حیثیت سے اسٹیٹ کی قوتِ قاہرہ ان پر مسلّط ہے اور ان کے افکار و تخیلات کی تکمیل کو جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے ۔ آزادیِ فکر و عمل کا بس نام ہی باقی رہ گیا ہے ۔ باقی ہر حیثیت سے انسان اس نئے اِلٰہ کا بے بس اور مجبور غلام ہے ۔ آپ کتنے ہی آزاد فکر اور آزاد رو ہوں ۔ لیکن اس فضا کو کیا کریں گے جو آپ کو ہر طرف گھیرے ہوئے ہے ؟ مدرسہ میں، اخبارات میں، ریڈیو پر، غرض ہر جگہ آپ کے کانوں میں وہی باتیں پڑیں گی جو اسٹیٹ کے مفید مطلب ہوں ۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ موجودہ زمانہ میں ہم اپنے مذہب اور دین و ایمان پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو یہ اس کی کم عقلی اور نارسائی فہم کی دلیل ہے ۔ حضرات صوفیا اور اولیائے کرام کے عہد میں نہ تو اسٹیٹ کی یہ نوعیت تھی اور نہ اس کا یہ ہمہ گیر اقتدار تھا ۔ اس لئے اعمال صالحہ کی تلقین اور انفرادی تزکیۂ نفوس کے کام کو انہوں نے کافی سمجھا تو یہ کوئی بڑی غلط فہمی نہ تھی ۔ لیکن فی زمانہ یہ کام کبھی سرسبز نہیں نہیں ہو سکتا ۔ جب تک کہ آپ اپنے ماحول اور اقدار حیات سے لڑ کر ان کو بالکل بدل نہ دیں ۔

(۵)

گذشتہ دو چار صدیوں سے مسلمانوں پر جو پست ہمتی، بے حسی اور مرعوبیت چھائی ہوئی ہے۔ اُس کا ایک ہلکا سا عکس ہمیں قُربِ قیامت کے مروجہ تخیل میں ملتا ہے۔ جس نے مسلمانوں کی عملی قوتوں کو بُری طرح مجروح کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ احادیث میں قربِ قیامت کے جو آثار بتائے گئے ہیں وہ آج پوری طرح نمایاں ہیں، کوئی تعجب نہیں ہے۔ اگر اس زمانہ میں ہر طرف کفر و شر کی طاقتوں کا غلبہ ہے اور اسلام کا علم سرنگوں ہو گیا ہے۔ قربِ قیامت کا یہ تخیل مسلمانوں میں ہمیشہ رہا ہے لیکن موجودہ شکل میں اس تخیل نے اس وقت سے زور باندھا جب سے مسلمانوں کے عوام اور رہنماؤں میں سے مجاہدانہ زندگی کا ذوق اور راہ حق میں صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ کم ہونا شروع ہوا۔ اپنی کمزوری اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کیلئے مسلمان عوام اور اُن کے مذہبی رہنماؤں نے غیر شعوری طور پر اس خیال کی اشاعت کی کہ اب قیامت کے آثار ہر طرف سے ظاہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کفر و شر کی قوتوں کا عام غلبہ خود ان علامتوں میں سے ہے جو قُربِ قیامت کے وقت نمودار ہوں گی، اس لئے دینِ حق کے قیام اور اسلامی نظام کے غلبہ کا خیال ہی ترک کر دینا چاہئے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اُس زمانہ کے آثار و علائم کی بابت احادیث میں یقیناً بہت کچھ بتایا گیا ہے جب قیامت نزدیک ہوگی۔ لیکن نہ تو اس زمانہ کا کوئی تعین کیا گیا ہے۔ اور نہ احادیث میں ہمیں کوئی ایسی قطعی بات ملتی ہے جس کی بناء پر تیقن کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ زمانہ جس کا احادیث میں تذکرہ ہے۔ ہمارا ہی زمانہ ہے۔ باقی رہا قیامت کا آنا تو وہ برحق ہے۔ لیکن کسی مسلمان کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ قیامت کی ٹھیک ٹھیک تاریخ معین کرے یا یہ بتا سکے کہ آئندہ سو دو سو برس میں قیامت ضرور آجائے گی۔ ممکن ہے کہ قیامت کل ہی آجائے اور یہ سارا ہنگامۂ کائنات یکسر معدوم ہو جائے، اور اس کا بھی امکان ہے کہ قیامت آئندہ پانچ چھ ہزار برس تک نہ آئے۔ احادیث میں جو آثار قیامت بتائے گئے ہیں اُن میں سے بعض آج سے بہت پہلے ظاہر ہو چکے تھے۔ بعض اس زمانہ میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور اکثر آثار ابھی بطنِ مستقبل میں پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرب و بعد کے تمام انسانی تصورات

اضافی ہیں۔ جو وقت ہمارے لئے صدیوں اور قرنوں کے طول رکھتا ہے وہ خدا کے شمار میں ایک یوم یا چند ایّام سے زیادہ نہیں ہے۔ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اپنے زمانہ میں قیامت کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کیا۔ کہ اب کفر و شرک کی طاقتیں غالب رہیں گی اور مسلمان مغلوب و مقہور ہو جائیں گے۔ قیامت کا خوف کرتے ہوئے بھی اُنہوں نے نہ تو کفر کے استیصال سے ہاتھ کھینچا، نہ ان پر کفر کا رعب طاری ہو سکا اور نہ اُن کے عزم جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خواہش میں یہ خیال کوئی رکاوٹ پیدا کر سکا۔ لیکن آج اس تخیل نے مسلمانوں میں عجز و بے چارگی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اور اُن کے ذہن میں یہ غلط خیال جم گیا ہے کہ چونکہ قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ اس لئے کفر و اسلام کی کشمکش میں غلبہ کفر ہی کو حاصل رہے گا۔ حالانکہ کوئی بڑے سے بڑا صوفی اور مجتہد تیقن سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے۔ جس کے آثار احادیث و روایات میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر اسلام ہی کائنات کی سب سے بڑی صداقت اور زندگی کا مکمل ترین نظام ہے تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ کفر و شرک کی طاقتوں کے سامنے اس طرح کمزور اور سرنگوں رہے۔ یقیناً اُس کائنات میں کوئی بنیادی نقص یا تضاد ہے۔ جس میں باطل کو حق پر مستقل اور دیرپا فتح حاصل ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کفر و اسلام اور حق و باطل کی آویزش میں کبھی میدان ایک کے ہاتھ رہتا ہے۔ اور کبھی دوسرے کے۔ دنیا میں خیر و شر کی ازلی کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس معرکہ آرائی میں باطل کو حق سے زیادہ فتح مندیاں نصیب ہوں۔ اگر گذشتہ دو چار صدیوں سے اسلامی نظام کے مقابلہ میں کافرانہ تہذیب و تمدن کا بول بالا رہا ہے تو اس سے یہ بات اور یقینی ہو جاتی ہے۔ کہ اب اسلام کی باری ہے۔ اور باطل کا علم سرنگوں ہو کر رہے گا۔ البتہ حق کی فتح اور کفر و شر کی شکست و ناکامی صرف ہماری جد و جہد، سعی و عمل اور ایثار و سرفروشی سے ہو سکتی ہے۔ نہ کہ

عالمانہ قیل وقال اور صوفیانہ وجد وحال سے ۔

قرب قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگ بڑی آسانی سے یہ بھول جاتے ہیں ۔ کہ احادیث میں ایک ایسے زمانہ کا ذکر بھی آیا ہے ۔ جب اعداء حق مغلوب ہوں گے ۔ خدا کا کلمہ اس کی زمین پر سب سے زیادہ بلند ہوگا ۔ اور دُنیا پھر ایک بار خیر القرون کی سعادتوں اور مسرتوں سے معمور ہو جائے گی ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بغیر جان و مال کی قربانی اور طویل جدوجہد کے از خود واقع نہیں ہوگا ۔ اس کائنات میں اسباب و مؤثرات سے ہٹ کر کوئی کام نہیں ہوتا ہے ۔ یہ تخیل بالکل بے معنی ہے کہ بس یکایک مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اور ساری دنیا میں کفر و فساد کی قوتیں خود بخود سرنگوں ہو جائیں گی ۔ دُنیا میں ایسی تبدیلیاں نہ کبھی ہوئیں ہیں نہ ہوں گی ۔ اسلام کا آغاز ، اس کا عروج اور اس کی کامیابیاں بھی مادی حالات و اسباب کے تحت ہوئی تھیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو وہ سارے اسباب و وسائل مہیا کرنے پڑے جو اس عالم اسباب میں کامیابی اور فیروزمندی کے ضروری شرائط ہیں ۔ اگرچہ عہد رسالت میں مسلمانوں کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ۔ وہ سب تائید ایزدی اور مشیتِ الٰہی کے تحت ہوئیں ، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انہیں بھی وہ سب کچھ کرنا پڑا جو ان کی جگہ کسی اور جماعت یا گروہ کو کرنا پڑتا ۔ لیکن مہدی کے متعلق مسلمانوں میں یہ عجیب تخیل پیدا ہو گیا ہے کہ بس اُن کے آنے کی دیر ہے اور بلا کسی کوشش و مشقت کے کفر و شر کی طاقتیں اپنی شکست مان لیں گی ۔ خرقِ عادت اور کرامات سے دُنیا میں کوئی انقلاب نہیں ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ انسان جو کام بھی کرے اُن قوانین کے اندر رہ کر کرے ۔ جن پر اس نے فطرتِ انسانی اور فطرتِ کائنات کی تخلیق کی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انبیاء کو اپنے مخالفین سے کشمکش اور ان کے خلاف صبر آزما مشقتوں اور قربانیوں کی ضرورت نہ پیش آتی ۔ بس نبی کے پیدا ہوتے ہی زمین و آسمان بدل جاتے ۔ اگر پہلے

ایسا نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے زمانہ بھی ایسا نہ ہوگا۔ ان کو بھی وہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ جو حضور رسالت مآب نے کیا یعنی وہ تمام اسباب و مؤثرات فراہم کرنے ہوں گے جن سے اسلام کو ایک غالب طاقت بنایا جا سکے۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آج اسلامی نظام کو عملی حقیقت بنانے کی جدوجہد شروع کی جائے تو کیا اس سے مہدی کے لئے راہ ہموار نہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور نقائص کی وجہ سے اسلامی نظام کو عملاً غالب نہ کر سکیں، لیکن کیا ہماری جدوجہد کے نتائج مہدی کی کوششوں کے لئے بے اثر رہیں گے اور ہم موجودہ پست حالت سے نکل کر بلند تر مدارج کے حصول میں کامیاب نہ ہوں گے؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ راہِ خدا میں سعی و عمل کی ناکامی کا تصور ہی غلط ہے۔ اس راہ کی ناکامی بھی کامرانی اور فیروزمندی کی سب سے قیمتی متاع ہے۔

"سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں"

راہ حق میں قربانی اور جدوجہد کے نتائج ہماری ظاہری نظر میں کتنے ہی مایوس کن ہوں۔ لیکن ان کی فتح مندی ایک اٹل حقیقت ہے۔ کائنات میں یوں تو کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اپنے نتائج نہ رکھتا ہو لیکن وہ عمل یقیناً بے نتیجہ نہیں ہو سکتا ہے۔ جس کے پس پشت رضائے الٰہی کی طلب اور دین حق کی محبت کا جذبہ کار فرما ہو۔

(۶)

جب اسلام کو ایک نظام تمدن اور ضابطۂ حیات کی حیثیت سے دنیا پر غالب کرنے کا نام لیا جاتا ہے اور اسی کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو بعض حضرات کی طرف سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے۔ کہ مذہب کو ایک دنیوی تحریک بنا کر مت پیش کرو۔ اسے ملکی اقتدار اور دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ دین و مذہب ایک روحانی حقیقت ہے جو مادی غلبہ اور تمدنی اقتدار کے بغیر بھی اپنا کام کرتی

رہتی ہے۔ دنیوی اقتدار دین میں فی نفسہ مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ ایک انعام ہے جو دینداری کے نتیجہ میں عطا ہوتا ہے، لہٰذا اسے حاصل کرنے کی سعی نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ صرف دیندار بن جانا چاہئے۔

اس اعتراض میں دو مغالطے ہیں۔ ایک روحانیت کا سراسر غیر اسلامی تخیل، اور دوسرا مذہب کو دنیوی اقتدار کے لئے وسیلہ بنانے کا خود ساختہ الزام۔

روحانیت فی الواقع انسان کی مادی زندگی سے الگ ہو کر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مسلمان کا ہر دنیوی عمل روحانی عمل ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے اخلاقی اقدار و غایات کے تابع ہو۔ وہ روحانیت نہیں بلکہ رہبانیت ہے جو انسان کی مادی اور عمرانی زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں روحانیت پیدا نہیں ہوتی۔ جو نماز روزہ اور درود و وظائف میں اس قدر زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں رہتی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روم و ایران کی فتوحات کے وقت فوجی تنظیم، لشکر کشی اور دیگر انتظامات میں جو وقت صرف کیا وہ یقیناً غیر دینی اور غیر روحانی عمل میں صرف نہیں ہوا تھا۔ مفتوحہ ممالک کے نظم و نسق، بیت المال کے انتظام اور ملکی امور کے انصرام کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ محض دنیاداری نہ تھی۔ جو وقت وہ معاشی کاموں میں صرف کرتے تھے اور جس میں وہ اپنے اہل و عیال کی طرف مشغول ہوتے تھے۔ وہ بھی غیر دینی عمل میں ضائع نہ ہو جاتا تھا۔ اگر ان سب اشغال کو چھوڑ کر وہ اپنا سارا وقت تہلیل اور درود و وظائف میں صرف کرتے تو اس سے ان کی روحانیت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقی اسلامی روحانیت سے وہ محروم ہو جاتے۔ کوئی دنیوی کام جب جذبۂ دینی کے تحت اور اسلامی نصب العین کی محبت میں کیا جائے تو پھر وہ دنیا کا کام نہیں رہتا بلکہ عین دینی کام ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے دنیاداری یہ ہے کہ ایک طرف ہم نمازیں پڑھیں، عبادات کریں، اور خدا کی محبت کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف ہم کفر و شر کی طاقتوں سے مداہنت کریں، کافرانہ تہذیب کے غلبہ پر راضی رہیں اور ارباب اقتدار کی

بُرائیوں اور ناحق شناسیوں کو خاموشی سے دیکھا کریں کہ مبادا اظہارِ حق سے ہمیں نقصان پہنچ جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہب کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی خواہش، دنیاوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اور ان دونوں کو خلط ملط کر کے ان پر ایک حکم لگا دینا سخت غلطی ہے۔ جو لوگ اپنے شخص یا خاندان یا قومی اقتدار کے خواہشمند ہوتے ہیں، انہیں اقتدار نصیب ہوتا ہے، تو یہ وہ انعام نہیں ہے۔ جو دینداری کے نتیجہ میں حاصل ہُوا کرتا ہے، بلکہ یہ خالص دنیا پرستی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا انعام ہے، اور اس سے کل کے فراعنہ اور آج کے انگریز، امریکن، جرمن، روسی، سب بہرہ ور ہیں۔ بخلاف اس کے جس اقتدار سے غرض یہ ہو کہ کفر کا غلبہ مٹے اور خدا کی زمین پر خدا کا دین غالب ہو اس کے مقصود و مطلوب ہونے سے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو دینِ اسلام کو محض سطحی طور پر جانتے ہیں، اس کی رُوح سے واقف نہیں ہیں۔ پھر تعجب یہ ہے کہ یہ اعتراض ان لوگوں کے خلاف کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔ جو علانیہ دنیوی اور سیاسی برتری کو مقصود بنا کر اس کے حصول کیلئے جائز و ناجائز طریقوں سے کوشاں ہیں اور جو دین و مذہب کو صرف عام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے اور ان میں وقتی جوش پیدا کرنے کیلئے ایک آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جدوجہد بجز دنیوی اقتدار اور قومی برتری کے حصول کی خواہش کے اور کس جذبہ پر مبنی ہے؟ کیا اس پوری سیاست میں کہیں جذبہ دینی کارفرما نظر آتا ہے؟ کانگریس کے ہمخیال علماء کو چھوڑ کر، جنہیں محض اپنی سیاسی گروہ بندی کی بناء پر اربابِ مسلم لیگ سے نفرت ہے اور کسی عالمِ دین کو اربابِ لیگ سے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ "خدا را اپنے دنیوی اور قومی مفاد کے حصول کو مذہبی رنگ نہ دو۔ اگر تم اپنی قومی بڑائی چاہتے ہو اور دنیوی اقتدار کے خواہاں ہو تو اس کے لئے ضرور ہاتھ پاؤں

مارو۔ مگر اس دنیا طلبی میں اسلام کا نام بیچ میں نہ لاؤ۔ تمہاری زندگی، تمہارے طریقہ کار اور انداز فکر کو اسلام سے کیا مناسبت ہے۔ مسلمانوں کو اسلام سے جو تھوڑی بہت محبت رہ گئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے تم اسلامی تہذیب اور اسلامی حکومت کا نام لیتے ہو، حالانکہ تمہارے غیر اسلامی طرز عمل اور دنیا داری کی روش سے اغیار اور ہندو ہم وطنوں میں اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن اسلامی حکومت اور مسلمان قوم کی حکومت میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ جب تمہاری سیاسی بازی گری دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلام کا نام سنتے ہیں تو ان دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔" اس کے برعکس جب مذہبی اقدار و غایات کے حصول اور صحیح اسلامی زندگی کی تشکیل کے لئے سیاسی اور دنیاوی اقتدار کے حصول کا نام لیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اسلام کو دنیوی تحریک مت بناؤ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر خالص دنیوی اغراض و مفاد کے حصول کے لئے مذہب کو وسیلہ بنا لیا جائے اور سیاسی اقتدار کی جدوجہد میں اسے بطور آلۂ کار استعمال کیا جائے تو یہ بالکل جائز اور درست ہے، لیکن اگر دنیوی اقتدار کے حصول کو مذہبی اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی جائے اور دین حق کو سربلند کرنے اور اسے ایک کارفرما حقیقت بنانے کیلئے سیاسی طاقت اور حاکمانہ اختیارات بطور وسیلہ مطلوب ہوں تو یہ مذہب کو ایک دنیوی تحریک میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے! " بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست"

(۷)

دنیا آج جن انقلابی قوتوں کے تصادم اور کشمکش کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے وہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں۔ جن میں نہ تو فہم حقیقت اور عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزلِ مقصود کا کوئی نشان۔ یہ تمام قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں سے وجود میں آئی ہیں اور اسی وقت تک دنیا میں فساد برپا کرتی رہیں گی اور انسان کو فریب آرزو میں مبتلا رکھیں گی۔ جب تک کہ یہ حالات ختم

نہ ہو جائیں یا اسلام ایک تازہ اور جاندار طاقت بن کر انہیں تباہ و برباد نہ کر دے۔ لیکن اپنی کورچشمی اور بےبصری کے باوجود ہیں بہر حال یہ قوتیں، اور قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کیا جا سکتا ہے، نہ کہ ضعف و بےچارگی سے۔ ہمارا موجودہ مذہبی نظام ان قوتوں کا حریف نہیں ہو سکتا، اس لئے نہیں کہ وہ ان کے مقابلہ میں صداقت کے عنصر سے خالی ہے یا اس کے بنیادی اصول بہتر نہیں ہیں بلکہ محض اپنی روح کی پژمردگی اور طاقت کی کمی کے باعث۔ ہماری مذہبی زندگی کا رشتہ اس سرچشمہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ جہاں سے اُسے قوت اور زندگی حاصل ہوتی تھی۔ یہ سرچشمہ حیات ایمان باللہ اور آخرت کا یقین ہے۔ جس کے فقدان نے ہمارے مذہبی اعمال کو بےروح بنا دیا ہے۔ ایمان باللہ صرف زبان کے اقرار سے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یقین کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یقین کی یہ شدت اب ہمارے اندر باقی نہیں رہی ہے۔ جس طرح درخت کی مضبوطی اور زندگی جڑوں کی طاقت پر منحصر ہوا کرتی ہے اور جڑوں ہی سے درخت کو اپنی پوری نشوونما کا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح مذہب دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کے پیروؤں کے دل و دماغ ایمان کی روشنی سے منور اور یقین کی پختگی اور شدت سے مالامال ہوں۔ کیونکہ ایمان ہی وہ مرکز قوت ہے جس سے مذہبی نظام کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کیلئے غذا اور سامان حاصل کرتے ہیں۔ جب اس نظام کی شاخیں اپنے مرکز قوت سے منقطع ہو جاتی ہیں اور ایمان کی قوت محرکہ کمزور پڑ جاتی ہے تو پھر سارے مذہبی اعمال زندگی کی روح اور جذبات کی طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں اور مذہب میں میکانیت، ضابطہ پرستی اور ظاہر پسندی کے صفات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جو جذبہ مذہبی کے کمزور ہو جانے کی علامتیں ہیں۔ آج مسلمان نماز بھی پڑھتا ہے، حج بھی ادا کرتا ہے، سال میں ایک دو مرتبہ ذکرِ میلاد بھی منعقد کرتا ہے اور دل میں کئی ایک بار خدا کا نام بھی لیتا ہے۔ لیکن یہ سب محض رسمی

طریقہ پر۔ ایمان کا حقیقی جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ایمان کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے۔ وہ یقین ہی نہیں جس کے اثرات براہِ راست انسانی زندگی میں نمایاں نہ ہو جائیں۔

"رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے"

آج جس چیز کو ایمان کہا جاتا ہے وہ حقیقتاً ایمان نہیں بلکہ اقرار لسانی ہے یا اسے زیادہ سے زیادہ عدم انکار کہا جا سکتا ہے۔ مصیبت کے وقت خدا کو پکارنا ایمان کی دلیل نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ مصیبت ہو یا راحت، تنگی ہو یا فراخی، دل اس کی یاد سے غافل نہ رہے اور زبان اس کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ ایمان یہ ہے کہ خدا کا تصور اور اس کی محبت ہماری زندگی اور وجود کے ہر گوشہ اور اعمال کی ہر شاخ میں اس طرح دائر و سائر ہو جس طرح خون رگوں میں گردش کرتا ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ (اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اُنہیں سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہوتی ہے)، والذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم (اور یہ لوگ ہیں جو خدا کو کھڑے بیٹھتے اور لیٹتے ہر وقت یاد کرتے ہیں)۔

جب خدائے برتر کا یقین اس طرح افراد کے ذہن و قلب پر پیوست ہو جاتا ہے۔ تب اُن کے اندر سے کفر و باطل کی مرعوبیت وھل کر نکل جاتی ہے اور وہ انقلابی قوت وجود میں آتی ہے جو شر کو کسی درجہ میں بھی گوارا نہیں کرتی اور ظلم و ناحق شناسی سے کسی قیمت پر بھی مصالحت نہیں کرتی۔ عہد رسالت اور صحابہ کرام کے زمانہ میں مذہب ایسی ہی انقلابی قوت تھا اور یہی انقلابی رُوح تھی جو دیکھتے دیکھتے ریگ زارِ عرب سے نکل کر اطرافِ عالم پر چھا گئی۔ اور جہاں پہنچی وہاں سے برائی ظلم، ناانصافی اور استحصالِ ناجائز کا قلع قمع کر دیا۔ اس نے کبھی شر سے مداہنت نہیں کی۔ اس نے کہیں اقتدار کے ظلم اور طاقت کی ناانصافیوں کو روا نہ رکھا۔ جب تک ہم مذہب کو پھر سے ایک انقلابی قوت میں تبدیل نہ کریں اور اس روح انقلاب کا عملی مظاہرہ

دُنیا کے سامنے پیش نہ کر دیں اس وقت تک نہ ہماری نمازیں اور دعائیں اسلام کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ مذہب کی خوبیوں پر فصیح و بلیغ تقریروں اور کتابوں کے انبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی گراں گوشی متاثر ہوگی۔ دنیا و دین کی برکتیں اور سعادتیں ان لوگوں کو نصیب ہونگی جنہیں محبت کا جنون اور عشق کا سودا ہے۔ جن کے قدم منزل کی جستجو میں سکون و راحت سے ناآشنا ہیں۔ جن کا عزمِ بلند اسلام کو ایک عالم گیر قوت اور ایک زندہ اور کارفرما حقیقت سے کم کسی حیثیت میں دیکھنے پر راضی نہیں ہے۔

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است　　بہشتے بہرِ اربابِ ہِمَم است
بہشتے فی سبیل اللہ ہم است　　بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش

بقیہ رسائل و مسائل

کون ہے، جو اس ناجائز خدمت پر تمہارا احسان مند ہوگا۔ اور کس سے اس بیجا سعی پر صلہ کی توقع رکھتے ہو؟ وہ غیر الٰہی نظامِ حکومت، جس کے ایک جز کی حیثیت سے آپ لوگ کام کر رہے ہیں، بجائے خود ناپاک ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خنزیر کے نظامِ جسمانی کی سی ہے، جس کی بوٹی بوٹی اور رگ رگ میں حرام سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کے کل پرزے بن کر آپ لوگ پہلے ہی گناہِ عظیم میں مبتلا ہیں، اب اس پر خیانت اور رشوت، اور باطل طریقوں کے ارتکاب کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو کیوں مزید خطرے میں ڈالتے ہیں؟ کیا کبھی موت آنی ہی نہیں ہے؟ یا مرنے کے بعد کوئی جائے پناہ تجویز کر رکھی ہے، جہاں خدا کی پکڑ سے بچ جانے کی امید ہے؟